بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دین انسان کی فطرت کے کسی تقاضے کا جواب اور اس کی زندگی کی کسی حقیقی ضرورت کی تکمیل ہے، یا یہ ایک غیر ضروری بوجھ ہے جسے انسان کسی غلط فہمی کے زیر اثر کندھوں پر لادے چلا آرہا ہے؟ اگر یہ ایک غیر ضروری بوجھ ہے تو یہ اس قابل ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اسے اتار پھینکا جائے۔ اگر یہ کسی حقیقی تقاضے کا جواب اور کسی واقعی ضرورت کی تکمیل ہے پھر اسے اس کے تقاضے اور اس کی ضرورت کی وسعت و اہمیت کے مطابق انسانی زندگی میں مناسب مقام حاصل ہونا چاہیے!

وہ ضرورت کیا ہے؟ وہ تقاضا کونسا ہے؟

یہ سوال دل میں لیے جب ہم اپنے گرد و پیش کی دُور دور تک پھیلی ہوئی دنیا پر پہلی ہی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ سارا عالم نور و ظلمت اور یہ تمام جہانِ رنگ و بُو بہترین نظم سے آراستہ اور بہترین آئین سے مالا مال ہے۔ یہ بے آئینی اور بدنظمی اور بے ترتیبی اور اندھیر گردی کی تماشا گاہ نہیں۔ مادے کی تمام کی تمام گوناگوں اشکال کشش و ثقل، سکون و حرکت، حرارت و برودت، قوت اور انرجی، لامعیت و اشعاعیت، نشو و نما، تغیر و حدوث اور عمل و ردّ عمل کے اٹل قوانین کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ قطرے اور سمندر، ذرات اور سورج، درخت اور پہاڑ، چیونٹیاں اور ہاتھی سب کے سب کوئی جنبش کیے بغیر نظم و ضبط کا جُوا اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی نگری ہے جس کی کوئی تعمیر مقررہ نقشے سے ہٹی بڑھی ہوئی نہیں ہے، ہر چیز اپنے صحیح استعمال کے لیے وقف ہے، پروگرام کے اوقات قطعی طور پر معین ہیں، حرکت کے لیے راستے بنے بنائے ہیں اور موجودات

کی گاڑیاں ان سے بال برابر اِدھر اُدھر نہیں ہوتیں، ٹریفک کے قواعد مقرر ہیں اور کوئی حرکت کرنے والا ان قواعد کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ہر کسی کے حدودِ عمل کو باحد گر الگ کر دیا گیا ہے، قوتیں اور فرائض تقسیم کر دیئے گئے ہیں چنانچہ بڑے سے بڑے وجود اور چھوٹے سے چھوٹے اجسام یک جا رہتے ہیں مگر کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا، تیز سے تیز اور سست سے سست رفتار پر موجودات کی بھاری بھرکم گاڑیاں بیک دم اربوں کی تعداد میں ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹنے والے راستوں پر دوڑ رہی ہیں، اور لاکھوں برس سے دوڑ رہی ہیں مگر بغیر کسی خلل کے یہ دور جاری ہے۔ ٹھوس اجسام اور مائعات اور گیسوں کی دنیا میں ایک دوسرے میں بالکل گتھی ہوئی ہیں مگر گڑبڑ نہیں ہوتی۔ جمادات اور نباتات اور حیوانات کے مختلف الاحوال عالم ایک دوسرے پر چھائے ہوئے ہیں مگر صلح و سلامتی سے نبھاؤ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس بستی کی ساری رونق آئین کا کرشمہ ہے، اس بزم کی ساری بہاہمی تنظم کا عطیہ ہے اور اس گھر کی ساری آبادی ہدایت کے دم قدم سے ہے! جس طاقت نے موجودات کو خلق کیا ہے، اُس نے آئین اور نظم بھی مقرر کیا ہے، اُس نے اُن کو ہدایت بھی دی ہے! یہی ہدایت ہر وجود کا "دین" ہے! کائنات کی بقا ہدایت، اور اس کے خالق کی ہدایت پر منحصر ہے، موجودات کا نشوو ارتقا دین، اور ان کے خالق کے دین پر دارومدار رکھتا ہے۔ یہاں جو چیز پیدا ہوتی ہے اپنی ہدایت اور اپنا دین ساتھ لے کے آتی ہے، یہاں مادہ کی جو نئی شکل بھی ظہور پاتی ہے اپنے لیے ضابطہ اور آئین گلے میں آویزاں کیے ہوئے نمودار ہوتی ہے، یہاں جو قوت بھی ابھرتی ہے اپنی پیشانی پر اپنا پروگرام لکھا کے لاتی ہے۔

جمادات کو دیکھیے تو ان کی ہدایت کا ذریعہ طبعی جبریت ہے، نباتات کا مطالعہ کیجیے تو فطرتِ نامیہ کو ان کی رہنمائی پر مامور پائیں گے، حیوانات کا جائزہ لیجیے تو جبلت ان پر نظامِ عمل واضح کرنے کے لیے سرگرم کار ملے گی! لیکن انسان کا معاملہ موجودات کے ان تینوں خانوادوں سے کچھ دور تک تو ہم آہنگ رہتا ہے! لیکن جہاں سے اس کی شعوری اور ارادی زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے بالکل نئی صورتِ حالات سامنے آجاتی ہے۔ انسانی زندگی کا ایک دائرہ ہے جہاں طبعی جبریت اپنا فرض ادا کرتی ہے، پھر

ایک دائرہ ہے جس میں فطرتِ نامیہ کام کرتی ہے، پھر ایک اور دائرہ ہے جس میں حیوانی جبلت کا پارٹ سامنے آتا ہے۔ لیکن ان دائروں سے آگے جب اخلاقی و اجتماعی میدان کا شروع ہو جاتا ہے تو یہ تینوں رہنما قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور ہر ایک معذرت کرتی ہے کہ اب اگر میں یک سر مُو بھی آگے بڑھوں تو پر جلتے ہیں!

سوال یہ ہے کہ کیا یہ شعوری، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کا دائرہ ایسا ہے کہ اس میں ہدایت امر دین کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

یہ لکیر ہے کہ جیسے پھاندتے ہی انسان کو ارادہ و اختیار کی گراں بہا ذمہ داری سے نواز دیا جاتا ہے یعنی اب کوئی قوت کشاں کشاں زندگی کو کسی لگے بندھے راستے پر بطورِ جبریت نہیں لے جائے گی، دوسرے لفظوں میں اب یک دم کئی راستے سامنے ہونگے اور ان میں سے راہِ حق اور صراطِ مستقیم کا انتخاب کرنا ہو گا، ہر قدم پر دوراہے اور چوراہے پیش آئیں گے اور اپنے ارادے سے کسی ایک پر سوچ سمجھ کر قدم بڑھانا ہو گا کہ کونسی راہ فلاح کی منزل کی طرف جانے والی ہے!

یہ ارادہ و اختیار انسان کو جس پوزیشن میں لا کے کھڑا کر دیتا ہے وہ بڑی پیچیدہ پوزیشن ہے۔ وہ یک وقت اپنے آپ کو طبعی ماحول اور اپنی ضروریات کی کشمکش میں بھی مبتلا پاتا ہے، اپنی خواہشات اور جذبات اور اپنی عقل کے درمیان بھی ہر لحظہ ایک نئے تصادم سے دوچار رہتا ہے، قریب کے فائدوں اور نقصانات اور دُور کے نتائج اعمال کے درمیان گھر کر بھی وہ بُری طرح اُلجھتا ہے، وہ اپنی ذات کی خود غرضانہ حس اور معاشرے کے اجتماعی تقاضوں کے درمیان بھی رسّہ کشی پاتا ہے، وہ قدامت پسندی اور جدت پرستی کی اونچ نیچ سے بھی دوچار ہوتا ہے، وہ افراط و تفریط اور عمل اور ردِّ عمل کے تند اثرات کی زد پر بھی آتا ہے۔ شعور و اختیار کی زندگی ان اُلجھنوں سے اس طرح بھری ہوئی ہے کہ آدمی کو جیسے ایک گھنے جنگل میں کھڑا کر دیا گیا ہو جہاں اونچے اونچے درخت سائیں سائیں کر رہے ہوں، کانٹے دار جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں، سر سے اونچی گھاس چاروں طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے ہو، طرح طرح کی بیلیں جال پھیلائے ہوئے ہوں اور جہاں کہیں کوئی خلا دکھائی دے، یہی گمان ہو کہ بس راہِ نجات یہی ہو گی۔ اُلجھنوں کے اس جنگل میں اہوائے نفسانی درندوں

کی طرح ہنہناتی پھرتی ہوں، جذبات کے ناگ پھنکار رہے ہوں اور شیطان وساوس کے غول کے غول دہان اتار رہے ہوں، زندگی کو اپنا شکار بنا لینے کے لیے پوری تدابیر لڑا رہا ہو۔

انسان کے پاس حواس خمسہ موجود سہی مگر وہ تو صرف گرد و پیش کے عالم مادی کے خواص سے آگاہ کر کے بس کر دیتے ہیں، عقل کا ایک ٹمٹماتا دیا بھی روشن سہی مگر وہ تو اسی تیل سے روشن ہے جو حسی علم سے فراہم ہوتا ہے، قیاس آرائی کی صلاحیت کارفرما سہی مگر یہ صلاحیت ہزار گھوڑے دوڑانے کے بعد بھی منزل یقین و آگہی تک تو نہیں پہنچاتی، یہ بھی تو کبھی گمان کی ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتی ہے، کبھی دوسری کی طرف اور کبھی تیسری کی طرف!

یہ پوزیشن ہے جہاں سیکولر فلسفے انسان کو لا کے کھڑا کر دیتے ہیں کہ جا بیٹا چڑھ جا سولی پر رام بھلی کریگا۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ ساری کائنات اسی امر کی گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خلق کر دینے کے بعد مخلوق کو ہدایت دیئے بغیر الجھنوں کے جنگل میں لاوارث چھوڑ دیتا ہے کہ جاؤ مرو یا جیو، مجھے کوئی واسطہ نہیں! وہ کہ جس کو مٹی کے ایک حقیر ذرے تک کی بقا کی فکر ہے، جو گھاس کی ایک بے قیمت سی پتی کے نشو و نما کا اہتمام کرتا ہے، جو ایک مچھر اور مکھی کے امن کا سر و سامان کرتا ہے، جو ایک بیل اور گدھے کے لیے لا اینڈ آرڈر مقرر کرتا ہے، کیا انسان جیسی اعلیٰ ترین مخلوق ہی اس کی نگاہ میں ایسی بے وقر ہو کے رہ گئی ہے کہ اس نے اسے بالکل عاق کر دیا ہو کہ جاؤ جہنم میں، تمہارے لیے میرے پاس کوئی رہنمائی نہیں، ضابطہ نہیں، ہدایت نہیں، دین نہیں!

اس بات کے ماننے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ سرے سے خدا کے ہونے کا انکار کر دیا جائے لیکن خدا کو مان کر اس کا یہ تصور باندھنا کہ وہ مخلوق تو پیدا کرتا چلا جاتا ہے، لیکن اس کو زندگی کی راہِ فلاح بتلانے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا، کسی معقول انسانی ذہن کو سجتا نہیں! کوئی اور اس تصور کو پیش کرتا ہو تو کرے، اسلام ایسے خدا کا تصور نہیں دلاتا۔ دوسرے انسان اسے قبول کر سکتے ہوں تو کریں، کسی مسلمان کا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔

انسانی ارادہ و اختیار کا راستہ عمل کی جن پیچ در پیچ وادیوں سے ہو کر جاتا ہے وہ تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی رہنمائی کا کوئی سروسامان ہو اور چونکہ اس کی زندگی شعوری زندگی ہے اس لیے اس کی رہنمائی بھی شعوری ہو۔ اس کو ہدایت دی جائے اور اس کی عقل کو خطاب کرکے دی جائے۔ اسے دین بہم پہنچایا جائے اور اس کے ارادہ و اختیار کی اپنی رضامندی حاصل کرکے پہنچایا جائے۔

وہ ایک ہدایت کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے طبعی ماحول اور اس کے تقاضا ہائے نفس کے درمیان کشمکش ہو تو وہ جان سکے کہ کہاں تک اسے آگے بڑھنا ہے اور کس صورت میں اسے پیچھے ہٹنا چاہیے وہ ایک ضابطے کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی خواہشات اور اس کی عقل کے درمیان رسہ کشی ہو تو وہ دونوں کو کس متعین نقطے پر جمع کرے۔ وہ ایک قانون کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے سامنے مختلف آراء اور اقدامات اور لائحہ ہائے عمل قریبی نتائج اور دُور کے نتائج کو پیش کرکے الجھن میں ڈالیں تو وہ کس کے مقابلے میں کس کا انتخاب کرے۔ وہ ایک دین کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی ذات کی خود غرضیاں اور اس کے معاشرتی ماحول کے تقاضے بیک وقت اس پر دباؤ ڈال رہے ہوں تو وہ اپنے آپ کو کس موقف پر جمائے؟ وہ ایک معیارِ فیصلہ کا ضرورت مند ہے کہ جب قدامت اور جدت، افراط و تفریط، عمل اور ردِّ عمل کے مختلف مؤثرات اس کی زندگی کے سامنے اپنے اپنے مطالبے رکھ رہے ہوں تو کسے وہ قبول کرے اور کسے رد کرے! وہ ضرورت مند ہے ایسی متعین حدود کا کہ خیر و شر کے معرکوں میں اسے معلوم ہو سکے کہ کہاں تک بڑھتے چلے جانا ہے اور کہاں پہنچ کر رک جانا ہے۔ وہ ضرورت مند ہے ٹریفک کے ایسے قواعد کا اور ایسے نشانات و علاماتِ راہ کا کہ جن کی پابندی میں وہ شہرِ حیات کے اندر افکار و اعمال کی گاڑیاں حادثوں کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر چلا سکے۔

انسان چونکہ ارادہ و اختیار رکھتا ہے، اس لیے وہ کسی دین اور ہدایت اور ضابطے کو صرف اسی صورت میں مان سکتا ہے جبکہ اس کے پیچھے کوئی ایسی اتھارٹی ہو جسے اس کی عقل واجب الاطاعت سمجھے۔ پھر ارادہ و اختیار ہی کی وجہ سے چونکہ وہ دین، ہدایت اور ضابطے میں دخل دینے اور تحریف اور رد و بدل کر دینے پر بھی قادر ہے ــــ اور اس کی خواہشات و جذبات کے تند ریلے ہر حد کو توڑ دینے کا موقع بھی

رکھتے ہیں، لہٰذا اس کی ضرورت ایک ایسا دین، ایک ایسی ہدایت اور ایک ایسا ضابطہ چاہتی ہے جس میں تقدس موجود ہو اور وہ ردّوبدل کے ارادے سے اس کی طرف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ پھر اس کی فطرتِ "بیم و رجا" تقاضا کرتی ہے کہ اس کے لیے دین اور ضابطۂ ہدایت ایسا ہو کہ جس سے انحراف کرنا موجبِ سزا اور جس کی اطاعت کرنا ذریعۂ حصولِ جزا ہو۔ پھر چونکہ انسانی زندگی کو مختلف زمانوں، مختلف قسم کے ماحول، اور مختلف حالات سے سابقہ پیش آتا ہے لہٰذا وہ ایسی رہنمائی کی ضرورت مند ہے جو ادلتے بدلتے حالات میں اسے یکساں کام دے سکے۔

یہاں تک ہم نے انسانی زندگی کے لیے دین کی جو ضرورت واضح کی ہے، ٹھیک اسی کا جواب ہے اسلام!

اسلام کے بالمقابل دوسرے کچھ مذہبی نظریے اور نظام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا فکری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرے سے اُس تقاضے اور اُس ضرورت کو پیش ہی نہیں کرتے جس کو پورا کرنے کے لیے انسان ایک دین چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ دین بہم پہنچانے کے بجائے محض ایک مذہب اور دھرم اور مَتْ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی ایسا ہے جو زندگی کو جبری عذاب قرار دے کر اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلانے والے وسیلے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، کوئی ایسا ہے جو روح کو سرور بخشنے کے لیے ایک مشروبِ مسکن، ایک نبیذِ خواب آور یا ایک بادۂ سرور بخش بن کر سامنے آتا ہے، کوئی ایسا ہے جو انسانی روح کے قطرے کو ذاتِ باری تعالیٰ کے سمندر سے جا ملانے کا پروگرام پیش کرتا ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ آدم کے گناہِ اول کے نتائج سے اولادِ آدم کو بچانے کی اسکیم سامنے رکھتا ہے۔ کسی نے انسان کی احتیاجِ ہدایت، اس کی تشنگیٔ دین اور اس کی طلبِ ضابطہ کا جواب بنا کر اپنے آپ کو متعارف نہیں کرایا اور نہ کاروانِ زندگی کی رہنمائی کی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی ہے!

ان مذہبی نظاموں نے ایک خدا، اور دو خداؤں، اور بے شمار خداؤں ——— اور ان کے علاوہ بے حد و حساب دیوتاؤں اور روحوں کا تصور انسان کو محض ایک روحانی تسکین کے لیے دیا ہے۔ انہوں نے اوہامی معتقدات کی بھول بھلیاں میں ڈال کر اسے حیرت زدہ اور مبہوت کرنے کی کوشش کی ہے۔

انہوں نے پوجا پاٹ، نفس کشی اور ترکِ دنیا کے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ آدمی ان کے اندر بھگتان بھگتتے ہوئے مگن رہے کہ وہ مایا کے جال، جیون کے عذاب اور گناہوں کے چکر سے نجات پانے کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے قلب کو جلا دینے کے لیے کچھ محدود اخلاقی ضابطے بھی بنائے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے میل اترتا ہے اور روح اس قابل ہو جاتی ہے کہ ذاتِ باری میں جذب ہو جائے۔

بس اس سے آگے نہ مذاہب نے انسانی زندگی کے بارے میں کوئی ذمہ داری قبول کی ہے، نہ کوئی کمانڈ اور ہدایت سیاست و تمدن کے معاملات میں فراہم کی ہے۔ آخر جو مذاہب دنیا کو ملعون اور ترکِ دنیا کو ذریعۂ نجات قرار دیتے ہیں، وہ خود اس "ملعون دنیا" کے لیے پروگرام اور منصوبہ اور ضابطے کیسے دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے سیاست و تمدن سے انسان کو بائیکاٹ کرنے کی تعلیم دی ہے وہ کیسے سیاست و تمدن کے لیے نقشۂ کار دنیا کے سامنے لا سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے زندگی کی ہماہمیوں کو ایک عقوبت اور ایک سزا اور گناہ کا ایک چکر قرار دیا ہے وہ کس منہ سے اُن ہماہمیوں کے درمیان کھڑے ہو کر نوعِ انسانی کو روزمرہ مسائل میں رہنمائی دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے دنیوی امارت و بادشاہت کے متعلق یہ خبر دی ہو کہ اس میں دلچسپی لینے والے "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہیں ہو سکتے اُن سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود ہی دنیوی امارت و بادشاہت کے نظم و انصرام کا کوئی درس دے سکیں گے۔

اس طرح کے مذاہب نے صدیوں سے انسان کو عجیب اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ اپنے معاملاتِ زندگی میں منہمک ہوتا ہے تو یہ اُسے ٹوکتے ہیں کہ خبردار! دنیا کے جنجال میں پڑ گئے تو خدا نہیں ملے گا۔ وہ خدا کی طرف ان کے بتائے ہوئے نقشے پر لپکتا ہے تو اس کا اپنا جسم کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی طبعی ضروریات اس کا منہ نوچتی ہیں، اس کے بال بچے بھوکوں مرتے ہیں، اس کا گھر اُجڑتا ہے، اس کا کاروبار تباہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دو قدم خدا کی طرف آگے چلتا ہے، پھر اپنے فطری تقاضوں کی کھینچا تانی کے زور سے اپنے دنیوی معاملات کی طرف چار قدم پیچھے پلٹتا ہے۔ پیچھے پلٹتا ہے تو احساسِ گناہ کا کانٹا ضمیر میں چبھتا ہے۔ وہ مذہب سے پوچھتا ہے کہ میرے لیے ان دنیوی معاملات میں کوئی رہنمائی ہے جو مجھے احساسِ گناہ سے نجات دلا سکے؟ اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اب یا تو وہ تمدن سے مستقل طور پر (باقی ص ۲۱۱)